© rasailojaraid.com

تدوینِ فقہ

(۲)

حضرت مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی صدر شعبۂ دینیات جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

عام طور پر متفقہہ جن کا دوسرا نام پچھلے زمانہ میں ملّا[۱] وغیرہ ہو گیا ان کی جن کمزوریوں کی لوگوں کو شکایت پیدا ہوئی اور جس کی عام طور پر تعبیر "خشکی" وغیرہ الفاظ سے کی جاتی ہے، میرا تو خیال ہے وہ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے، شریعت کے لفظ سے دھوکہ کھا کر ان لوگوں نے سمجھ لیا کہ فقہی مسائل پر عمل کر لینا گویا کامل اسلام کی تعمیل کے لئے کافی ہے حالانکہ زیادہ سے زیادہ ان مسائل پر اگر پوری قوت وعزم سے عمل کرنے کی سعادت کسی کو میسر آ بھی جاتی ہے جب بھی "قوتِ محرکہ" کی بیداری کے سوا

---

[۱] ملّا کا یہ لفظ مسلمانوں میں مذہبی پیشواؤں کی ایک قسم کے لئے جو بولا جاتا ہے علمار کا اختلاف ہے کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے۔ علامہ شہاب محمود الالوسی البغدادی جن کی تفسیر روح المعانی بڑی معرکۃ الآرا تفسیروں میں شمار ہوتی ہے انھوں نے قسطنطنیہ کے سفرنامہ میں ایک موقع پر "ملا" کے لفظ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بعض لوگ میم کو زبر دے کر اس کا تلفظ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ من لا یجھل (جو نہیں جاہل ہے) کی یہ تخفیف شدہ شکل ہے "یجھل" کا لفظ ساقط ہو گیا صرف "من لا" رہ گیا۔ نون کو لام میں مدغم کر دیا گیا۔ ایک قول یہ بھی نقل کیا ہے کہ "املاء" جس کے معنی لکھ دینے کے ہیں اسی سے ملا کا لفظ ماخوذ ہے انھوں نے لکھا ہے کہ بعض لوگ مولی کو جو اس لفظ کی اصل بتاتے ہیں یہ میرے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ ان کے بیان سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ فارسی یا ایرانی زبان کے کسی لفظ سے بنا ہو اسی بنیاد پر یہ خیال کہ ترکستان تبت وغیرہ میں بودھ مذہب کے پیشواؤں کے آخر میں "لامہ" کا لفظ جو آتا ہے جیسے "ڈلائی لامہ" تبت کے بودھ پیشوا کا خطاب ہے تو کیا اسی "لامہ" کو الٹ کر "ملا" کا لفظ بخارا خراسان میں بنا لیا گیا ہے واللہ اعلم صوفی کے لفظ کی اصل جب تھیا سوفسٹ وغیرہ یونانی الفاظ بن سکتی ہے، تو لاماسالٹ کر ملا کے ہو جانے میں کیا تعجب ہے۔ دیکھئے الوسی کی کتاب نشوۃ السوول فی سفر استامبول ص ۱۰۰ - ۱۲ منہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور تمام قوتیں ان کی پھر بھی سوئی کی سوئی ہی رہتی ہیں اور ان ہی کی خوابیدگی ان سے وہ اعمال صادر کراتی ہے جن سے لوگوں میں گرانی پیدا ہوئی، اگر ان کو معلوم ہوتا کہ فقہ میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے وہ دین کا صرف پانچواں حصہ ہے تو غالباً اس غلطی کے شکار نہ ہوتے کہ ہم سب کچھ ہو چکے، حالانکہ ابھی بہت کچھ کرنا باقی رہ جاتا ہے، یہی نہیں بلکہ "الفقہ" جس کا تعلق دین کے صرف پانچویں حصے سے ہے اور پانچواں حصہ بھی وہ جو صرف ظاہری اعمال و افعال سے تعلق رکھتا ہے، اس علم میں قصداً جہاں تک میرا خیال ہے ائمہ مجتہدین نے خلط مبحث سے بچنے کے لئے بکثرت ایسے مسائل بیان کئے ہیں جو "قوت محرکہ" کی حد تک تو بالکل صحیح ہیں کیونکہ اس فن میں ان کے پیش نظر مسئلہ کا صرف ظاہری اور قانونی پہلو رہتا ہے۔ لیکن دوسری قوتوں کے اعتبار سے بعض دفعہ وہ عجیب باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً فقہ کی کتابوں میں تصریح کے ساتھ لکھا جاتا ہے کہ "غیبت کرنے سے روزہ نہیں ٹوٹتا" یا مثلاً نماز کی روح ظاہر ہے کہ خضوع خشوع ہے حالانکہ قرآن میں اس کا حکم ہے۔

لیکن لوگوں کو سن کر حیرت ہوگی کہ باوجود قرآنی مسئلہ ہونے کے فقہ کی عام کتابوں میں وجوب و فرضیت تو بڑی چیز ہے اس کے مستحب ہونے کا بھی ذکر نہیں، ہمارے استاذ مولانا انور شاہ الکشمیری قدس اللہ سرہٗ نے بڑی مشکل سے فقہ کی سینکڑوں کتابوں کے مطالعہ کے بعد ایک غیر مشہور غیر مطبوعہ کتاب "اختیار" نامی میں دیکھا تھا کہ نماز میں خشوع بھی مستحب ہے۔ عموماً طلبار کے سامنے اپنے اس اکتشاف کا ذکر فرماتے تھے۔

بہر حال غیبت کے متعلق صحیح حدیثوں میں ہے کہ روزہ میں جو غیبت کرتا ہے، اس کو اپنے روزہ سے بھوک پیاس کے سوا کچھ نہ ملا، یعنی روزہ کالعدم ہو جاتا ہے اور یہی حال نماز میں خشوع کا ہے قرآن میں جب اس کا ذکر ہے، اسی سے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ پھر فقہار کے اس طرز عمل کا کیا مطلب؟ واقعہ یہ ہے کہ فقہار جس وقت فقہ کے مسائل بیان کرتے ہیں، اس وقت ان کے سامنے اس عمل کے صرف وہی بیرونی عناصر ہوتے ہیں جن کا تعلق آدمی کے قوتِ محرکہ سے ہے۔ لیکن جن امور کا تعلق قوتِ قلبیہ یا واہمہ یا متخیلہ سے ہے۔ چونکہ ان کے مباحث کا تعلق دوسرے فنون سے ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس لئے فقہ کی حد تک اپنے آپ کو ان مسائل کے بیان کرنے کا ذمہ دار نہیں خیال کرتے۔ مثلاً طبیب سے اگر کوئی پوچھے کہ فلاں باغ کے امرود چرا کر میں کھاؤں تو طبیب کے لئے طبیب ہونے کی حیثیت سے یہ بتانا قطعاً غیر ضروری ہے کہ نہیں دوسروں کا مال چرانا نہیں چاہیئے، کیونکہ یہ مذہب یا قانون کا مسئلہ ہے لوگ فقہاء کے اس طرز عمل سے چونکہ عموماً واقف نہیں ہوتے اس لئے بعض دفعہ فقہ کے مسائل سے متعلق انھیں اچنبھا ہوتا ہے، حالانکہ ان کو یہ معلوم ہونا چاہیئے تھا کہ فقہ کی کتابوں میں مسائل کی صرف ظاہری عملی شکل دیکھی جاتی ہے، باقی اس فعل کا اور جن قوتوں سے تعلق ہے اس کا ذکر فقہ میں نہیں بلکہ ان علوم میں ملے گا جن میں ان قوتوں کے متعلقہ مسائل بیان کئے گئے ہیں، قدیم زمانہ میں اسی لئے دستور تھا کہ فقہ کے پڑھنے کے بعد لوگ دوسری قوتوں کے اہلِ علم کے پاس جاتے تھے۔ محض مدرسہ کا علم انسانیت کی تکمیل کے لئے نہ پہلے کافی ہوا اور نہ اب ہوسکتا ہے، جب تک خانقاہی علوم کا بھی ان کے ساتھ اضافہ نہ کیا جائے۔

کس قدر عجیب بات ہے کہ "العملیات" کے ان مسائل کے سمجھنے سمجھانے، سیکھنے سکھانے، پڑھنے پڑھانے کے متعلق آج تک کسی نے نہیں پوچھا کہ اس کے لئے کسی ماہر فن استاد کے پاس جانے اور دن گذارنے کی ضرورت ہے یا نہیں، ہر شخص بداہتہً جانتا ہے کہ یہ علم ہے اور علم کی تحصیل عالم ہی کی صحبت میں ہوسکتی ہے محض کتابوں کے مطالعہ سے اس لئے کہ جس زبان میں وہ کتابیں ہیں چونکہ مطالعہ کرنے والا اس سے واقف ہے آج تک نہیں سنا گیا کہ کسی نے علم حاصل کیا ہو، الا الشاذ کالمعدوم جو عام نظیر نہیں بن سکتی، گویا ایک "قوتِ محرکہ" کے متعلقہ مسائل منصوصہ ہوں یا غیر منصوصہ، یہ طے شدہ ہے کہ ان کے سمجھنے کے لئے استاذوں کے حلقہائے درس کی حاضری ناگزیر ہے لیکن ایک قوت نہیں انسانی فطرت کی چار چار اساسی اور حقیقی قوتیں جن پر سچ پوچھئے تو قوتِ محرکہ کے عملی مسائل کی نتیجہ خیزی اور بارآوری مبنی ہے، ان کے متعلق جو کچھ قرآن میں ہے جو کچھ حدیث میں ہے۔ صدیوں سے ہزارہا ہزار دماغوں نے مختلف ممالک واقطار میں فکر و نظر سے جو نتائج و نظریات پیدا کئے ہیں، ان سب کے سمجھنے، اور ان سے صحیح طور پر استفادہ کے لئے ان مسائل کے ماہرین فن کی صحبت و ملازمت کی ضرورت ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یا نہیں، یہ مسئلہ خصوصاً اس زمانہ میں اتنا نا قابل توجہ بنا ہوا ہے کہ صرف ضرورت و عدم ضرورت ہی نہیں بلکہ جواز و عدم جواز تک کی بحث چھڑی ہوئی ہے۔

آخر آج کل عموماً جو یہ پوچھا جاتا ہے کہ پیری و مریدی کی کیا حاجت ہے؟ اور جواب میں ایک بڑے طبقے کو صرف عدم ضرورت ہی نہیں، بلکہ عدم جواز پر بھی اصرار ہے کیا دوسرے لفظوں میں اسی فطری ضرورت کا یہ انکار نہیں ہے، جس کا میں نے اظہار کیا۔ محض اس لئے کہ فقہ کے مدرسین عموماً اس زمانہ میں صحیح طور پر ہدایہ بھی مثلاً نہیں پڑھا سکتے، کیا فقہ کی تعلیم کے بے ضرورت ہونے کی دلیل بن سکتی ہے۔

پھر جن لوگوں نے قوتِ محرکہ کے سوا دوسری باطنی قوتوں کے متعلقہ علوم کے جاننے کا مدعی بن کر ان علوم سے قطعاً ناواقف ہونے کے باوجود ارشاد و ہدایت کی گدیوں پر زبردستی قبضہ کر لیا ہو محض ان کی جہالت کو دیکھکر ان علوم کے ماہرین کی تلاش کیا بے ضرورت ہو سکتی ہے مالکم کیف تحکمون۔ چونکہ ایک بڑی اہم دقیقے پر اس بیان میں تنبیہ کی گئی تھی۔ جس سے عموماً غفلت برتی گئی ہے اس لئے ضرورت سے زیادہ مضمون سے گونہ بے تعلق ہونے کے باوجود میں نے کچھ طوالت سے قصداً کام لیا بہر حال اس مضمون کو ختم کرتے ہوئے اسی کتاب میں جو یہ لکھا ہے کہ

ثم من حکم تلك المسائل	پھر ایسے مسائل (یعنی جن کی صحت بغلبہ ظن مانی جاتی ہے)
ان تردعند معارضتہا النص	ان کا حکم یہ ہے کہ جب شریعت کے نصوص اور تفریعات
ایاہا وتقبل اذا کان	سے تعارض و تصادم پیدا ہو تو ان کو رد کر دیا جائے گا
تفریعہا علی طریق	اور اگر استوار و محکم راہ سے ان کو پیدا کیا گیا ہے تو ان
قویم	کو تسلیم کیا جائے۔

لیکن ظاہر ہے کہ کلی طور پر یہ بات کچھ غیر فقہی علوم و فنون کے ساتھ ہی مختص نہیں ہے، بلکہ سب جانتے ہیں کہ ائمہ مجتہدین میں سے ہے ہر ایک نے ہمیشہ اپنے متبعین کو اسی کی وصیت فرمائی ہے جس کا ذکر شائد آئندہ میں کرونگا بھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن اس کا پتہ چلانا اور یہ فیصلہ کرنا آسان نہیں ہے کہ بزرگوں نے فقہی و غیر فقہی علوم میں جن استنباطی مسائل کا اضافہ فرمایا ہے وہ نصوص یعنی "الکتاب والسنۃ" سے کس حد تک مخالف ہیں، یہ ہر عامی آدمی کا کام نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں صاحبِ کتاب نے ایک عجیب نکتہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، کاش لوگ اس کو اگر پیشِ نظر رکھیں تو عموماً اجتہادی نتائج اور قیاسی مسائل کے متعلق نصوص سے تعارض یا بے تعلقی کا جو مغالطہ عامیوں کو ہوتا رہتا ہے اس کا بآسانی ازالہ ہو سکتا ہے، فرماتے ہیں کہ ان قیاسی مسائل کے متعلق خواہ ان کا تعلق کسی قوت سے ہو، یعنی اصطلاحی فقہ کے مسائل ہوں، یا غیر فقہ کے سب کے متعلق اس کا خیال کرنا چاہیئے کہ

منہا ما ھی
مبادی فمناط
ردھا وقبولہا
ھوا فضاؤھا
الی الغایات
وارتباطہا
بالمقاصد اوعدمہ

ان مسائل میں بعض مسائل کی حیثیت مبادی اور مقدمات کی ہوتی ہے یعنی شریعت کا جو اصل مقصود ہے اس تک پہنچنے میں ان سے مدد ملتی ہے، اس قسم کے مسائل کے قبول کا معیار (یہ نہیں ہے کہ نصوص سے براہِ راست ان کا تعلق دیکھا جائے بلکہ) یہ دیکھنا چاہیئے کہ جن مقاصد کے حصول کا ان کو ذریعہ قرار دیا گیا ہے وہ حاصل ہو سکتے ہیں یا نہیں۔ اور اس حیثیت سے شریعت کے اصل مقصد سے ان کا تعلق ہے یا نہیں۔

آج فقہ و اصول فقہ کے بعض مسائل کے متعلق جو یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ ان کا شریعت سے کوئی تعلق نہیں ہے اگر مولانا کے اس نکتہ کو سامنے رکھ لیا جائے تو اس دعوی کی غلطی بآسانی ظاہر ہو سکتی ہے اور یہی حال صوفیہ وارباب سلوکِ تصفیہ کے بعض رسوم و اعمال کا ہے یعنی محض مبادی اور مقدمات کی حیثیت سے ان کو اس لئے اختیار کیا گیا ہے کہ جن قوتوں کی تربیت و تصحیح ان کے پیشِ نظر ہے، اس میں ان سے مدد ملتی ہے۔ اگرچہ ان مبادی میں بھی اکثر و بیشتر وہی چیزیں ہیں جن کا رشتہ کسی نہ کسی حیثیت سے نصوص سے مل جاتا ہے، لیکن بعض امور جو بالکل بے تعلق معلوم ہوتے ہیں، مولانا ان کے متعلق فرماتے ہیں اور سچ فرماتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ثم منها ما هي	ان امور میں بعض کا تعلق (تو نصوص سے) قریب ہے اور وہی امور
قريبة وهي	ہیں جن کا دین سے ربط ظاہر ہے، اور بعض چیزیں ایسی بھی
الظاهر وجه	ہیں جن کا تعلق بعید ہے اور یہ وہی چیزیں ہیں، جن کے
ارتباطها	تعلقات ذرا پوشیدہ ہیں (یعنی ہر کس و ناکس کا کام نہیں ہے کہ
بالمقاصد ومنها	شریعت کے اساسی نصوص سے ان کا جو تعلق ہے اس سے
ما هي بعيدة	بآسانی واقف ہو جائے بلکہ کافی غور و فکر اور فن کی مہارت
وهي مخفية۔	کے بعد یہ بات آدمی پر کھلتی ہے)۔

خلاصہ یہ ہے کہ جس نقطۂ نظر سے فقہ کے قیاسی مسائل کو دیکھا جاتا ہے، کاش! ہمدردی کی یہی نگاہ فقہار کی صوفیار کے علوم مخدومہ کے متعلق ہوتی، تو ملا اور صوفی کے قدیم جھگڑوں کا بآسانی تصفیہ ہو سکتا ہے، اور سچ تو یہ ہے کہ "الفقہ" کی قدیم تعریف جو حضرت امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے کتابوں میں یہ نقل کی جاتی ہے جیسا کہ ابن نجیم نے بھی لکھا ہے۔

وعرفه الامام بأنه	آدمی کا یہ جاننا کہ کن کن چیزوں سے اسے نفع پہنچ سکتا
معرفة النفس ما لها و	ہے اور کن چیزوں سے ضرر، امام ابو حنیفہؒ نے فقہ کی
ما عليها (بحر الرائق ص ۱)	یہی تعریف کی ہے۔

فقہ کی اسی تعریف کو اگر باقی رکھا جاتا اور النصوص کے دلالات، اشارات، اقتضاءات، مضمرات سے انسانی فطرت کی جن جن قوتوں کے متعلق مسائل پیدا ہوتے سب ہی کو "فقہ" سمجھا جاتا تو شائد شریعت و طریقت کا یہ جھگڑا سرے سے پیدا ہی نہ ہوتا، کیونکہ امام صاحب کی یہ تعریف موجودہ اصطلاحی فقہ کی تعریف نہیں ہے بلکہ یہ "تو الدین" کی وہ جچی تلی صحیح تعریف ہے جس کی طرف عوام تو عوام خواص کی نگاہ بھی بہ مشکل پہنچ سکتی ہے۔

آج کتنے ہیں جو اس سوال کے جواب میں سر بگریباں ہو جاتے ہیں کہ دنیا کے تمام علوم و فنون کا جیسے خاص خاص موضوع بحث ہوتا ہے کسی فن میں الفاظ سے کسی میں طبعی موجودات سے کسی میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

فلکیات سے مثلاً بحث کی جاتی ہے، اسی طرح بتایا جائے کہ مذہب ہی جب علم ہے تو اس کا موضوع بحث کیا ہے۔

معمولی آدمیوں سے نہیں، بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے حضرات نے اس کے جواب میں کبھی خدا کبھی معاش کے مقابلے میں معاد یعنی اخروی زندگی وغیرہ مختلف چیزیں پیش کیں حالانکہ بات وہی تھی جو امام صاحبؒ نے فرمائی کہ مذہب کا موضوع "النفس" یعنی خود نفسِ انسانی ہے۔

مطلب وہی ہے جو میں عموماً کہا کرتا ہوں کہ دنیا جہان کی چیزوں سے تو انسان بحث کرتا ہے اور الدین یا مذہب میں خود اس بحث کرنے والے یعنی "الانسان" ہی سے بحث کی جاتی ہے جس کی دوسری تعبیر امام کے لفظ میں "النفس" ہے، اسی النفس یا نفسِ انسانی کے مالہا (جن چیزوں سے اسے نفع پہنچے) اور ما علیہا (جو چیزیں انسانیت کے لئے مضر ہوں) ان کا جاننا ہی تو مذہب ہے، مطلب یہ ہے کہ ارتقار وعروج کے آخری نقطوں تک پہنچنے میں نفسِ انسانی کو کن کن چیزوں سے مدد ملتی ہے اور اس راہ میں کن کن چیزوں سے نقصان پہنچتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہی اس علم یا فن کا خلاصہ ہے جسے مذہب یا مذہبی علوم کہتے ہیں، اس سلسلہ میں چونکہ خدا، جنت و دوزخ، جزا و سزا، نبوت و وحی ملائکہ جبر و قدر، برزخ وغیرہ سینکڑوں چیزوں کے جاننے اور سمجھنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے مذہب میں ان سے بحث کی جاتی ہے۔

ٹھیک اسی طریقہ سے جس طرح طب کا اصلی موضوع تو انسان کا جسدی نظام ہے جس میں حیوان بھی اس کے شریک ہیں، اب اس نظام کی صحت و عدم صحت کے سلسلہ میں سینکڑوں دوائیں، ان دواؤں کے بنانے کی ترکیبیں، جراحی کے اعمال وغیرھا کے جاننے کی بھی ضرورت ہوتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ ان چیزوں کو فنِ طب میں موضوعِ بحث کی حیثیت حاصل نہیں۔ اسی طرح نفسِ انسانی تو مذہب کی بحث و تحقیق کا اصل موضوع ہے اور مذہبی مباحث و مسائل کے دیگر عناصر واجزار کی حیثیت موضوع کی نہیں ہے۔ خواہ بذاتِ خود مذہب میں ان کی جتنی بھی اہمیت ہو، اسی لئے ہر زمانہ میں بنی آدم نے "اول خویش بعدہ درویش" پر عمل کرتے ہوئے سب سے زیادہ مذہب اور مذہبی علوم ہی کو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اہمیت دے رکھی تھی۔

لیکن آہ! کہ نسلِ انسانی کی وہ جماعت جونسوا اللہ (خدا کو بھول گئی) کی سزا میں فانسٰا ھم انفسہم (پھر بھلا دیا خدا نے ان کو ان ہی سے) کی سزا بھگت رہی ہے اس نے ہر چیز کو اپنے دماغ میں ٹھونستے ہوئے خود اپنے آپ کو اپنے حافظہ سے نوچ کر باہر پھینک دیا، یا اس کے حافظہ سے خود اپنی ہستی کا احساس اور اس کی قدر و قیمت سرا سر پھسل کر باہر نکل گئی، اسی کا نتیجہ ہے کہ عہدِ حاضر کی تعلیم گاہوں میں جیسا کہ میں نے پہلے بھی کبھی لکھا ہے کہ سانپ اور سانپ کے بچوں، کتے اور کتوں کے پلوں سے بحث کرنے کے لئے مخصوص کرسیاں قائم ہیں، کائنات کے ایک ایک ذرہ کے لئے مستقل فیکلٹیاں بلکہ مستقل تعلیم گاہیں کھولی جا رہی ہیں لیکن جوامع وکلیات کے ان طویل وعریض سلسلوں میں جو چیز ناقابلِ بحث قرار دی گئی ہے وہ بیچارا مسکین خود یہی انسان ہے، ہر چیز کے بناؤ اور بگاڑ ان کی قدرتی صلاحیتوں کے صلاح و فساد کی راہ میں انسانی توانائیوں کا ایک ایک قطرہ خرچ کیا جا رہا ہے لیکن جس بیکس کی فطری قوتوں کو جنگل کے کانٹوں کی طرح ہر قسم کی داشت ونگرانی سے بے نیاز قرار دیا گیا ہے وہ آج صرف آدمؑ کی اولاد ہے۔ مذہب جو ہر زمانہ میں تمام علوم کے مقابلہ میں چوٹی کا علم سمجھا جاتا تھا، آج اسی کو علمی دائروں سے شہر بدر کر دیا گیا ہے۔

سمجھنے والے سمجھ رہے ہیں کہ ہم نے مذہب کو نکالا ہے حالانکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ان مسکینوں نے خود اپنے آپ کو اپنے حافظہ سے باہر نکال دیا ہے اور یہ بھی قرآن کا ایک معجزہ ہے کہ اس کا دعویٰ فانسٰا ھم انفسہم (بھلا دیا ہم نے ان کو ان ہی سے) جو بظاہر ایک ناقابلِ فہم سی بات معلوم ہوتی تھی، وسوسہ ہوتا تھا کہ آدمی کا حافظہ کمزور بھی ہوگا تو اتنا کیا ہوگا کہ خود اپنے آپ کو وہ بھول جائیگا۔ لیکن جو بات سوچی نہیں جا سکتی تھی وہی دیکھی گئی۔ اور خدا ہی جانتا ہے کہ اس دردناک سانحہ کو نسلِ آدم کب تک دیکھے گی۔ فللہ الحجۃ البالغہ۔

خیر یہ تو ایک ذیلی بات تھی، لاکھ چاہتا ہوں کہ جو کچھ دکھایا جا رہا ہے اسے صرف دیکھتا رہوں اس وقت تک دیکھتا رہوں جب تک قدرت کی طرف سے اس کا دکھانا مقدر ہو چکا ہے لیکن سرگذشت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں میرے سینہ میں بھی انسان کا دل ہے، اپنے ابنار جنس کے اس عجیب و غریب ذہنی انقلاب پر دل تڑپ اٹھتا ہے اور جو کہنا نہیں چاہتا تھا بے ساختہ قلم پر آجاتا ہے۔

بہر حال اصل گفتگو فقہ کی اس تعریف میں ہو رہی تھی جو امام رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے میں یہ کہہ رہا تھا کہ امام نے جو تعریف فقہ کی کی ہے، یہ دین کے تمام شعبوں اور مذہبی علوم کی تمام شاخوں کو حاوی تھی۔

لیکن مختلف اسباب و وجوہ کا اقتضا یہ ہوا کہ امام صاحب کی بھی زیادہ توجہ ان ہی مسائل کی تدوین و ترتیب پر صرف ہوئی جن کا تعلق "قوتِ محرکہ" سے تھا، سب سے بڑی وجہ تو وہی تھی جس کا ذکر آئندہ ذرا زیادہ تفصیل سے کروں گا، یعنی دینی پیغام ہونے کے ساتھ ساتھ اسلام چونکہ ایک سیاسی نظام بھی تھا، آناً فاناً اسلامی محروسہ میں انسانوں کی ایک بڑی تعداد داخل ہو گئی جن کے لئے آئین اور قانون کی ضرورت تھی۔

نیز اسلام میں عملی عبادات کا جو حصہ ہے عمل ہونے کی وجہ سے آئے دن مختلف جزئی پیچیدگیاں ان میں پیدا ہوتی رہتی ہیں جیسے دیگر قانونی معاملات اور آئینی ضوابط کا حال ہے۔

جہاں تک میرا خیال ہے اسی چیز نے ا[illegible]ریں ائمہ کو دین کے اس خاص شعبہ میں مشغول کر دیا۔ جس کا تعلق زیادہ تر قوتِ محرکہ ہی سے تھا۔ ورنہ سچ یہ ہے کہ جن ائمہ مجتہدین نے اسلام کے ان چند عملی ابواب کے متعلق فقہ کا موجودہ سرمایہ پیدا کر دیا ہے، اگر ان ہی حضرات سے دین کے دوسرے شعبوں کے مسائل بھی مروی ہوتے تو یقیناً وہ بھی اسی قدر عجیب چیز ہوتی جتنی آج فقہ کا حیرت انگیز مجموعہ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔

ان بزرگوں کو خدا کی طرف سے فہم و بصیرت کا جو حظِ وافر ملا تھا، کلیات سے جزئیات پیدا کرنے کا صالح اور قویم سلیقہ ان میں تھا، نیز دوسرے سازگار حالات جو ان کو میسر تھے مثلاً عہدِ نبوت سے قرب، صحابہ اور صحابہ کے صحبت یافتہ بزرگوں سے براہِ راست استفادہ کے مواقع یہ خصوصیتیں اور یہ آسانیاں ایسی خصوصیتیں اور ایسی آسانیاں ہیں۔ جو ان تک صرف ان ہی تک محدود ہیں، ان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ائمۂ اسلام کے جو حالات و واقعات تاریخوں میں محفوظ ہیں، ان سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ صرف "قوتِ محرکہ" ہی کے متعلقہ مسائل ہی نہیں، بلکہ ان تمام دوسری قوتوں کے متعلقہ علوم جن سے بجائے فقہ کے دوسرے اسلامی فنون میں آج بحث کی جاتی ہے، علماً و عملاً ہر حیثیت سے ان کو بھی وہی تعلق تھا جو کسی فن کے مجتہد اور امام کو ہو سکتا ہے۔ ملا علی قاری نے اپنے مناقب میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق ایک موقعہ پر ذکر کیا ہے۔

عن حازم قال كلمت اباحنيفة في الزهد والعبادة واليقين والتوكل ففصل لي كل باب على حدة ۔ [1]	حازم کہتے ہیں، میں نے امام ابوحنیفہؒ سے زہد اور عبادت یقین اور توکل کے مسائل کے متعلق گفتگو کی تو انھوں نے ان میں سے ہر باب کی تشریح الگ الگ کرکے بتائی۔

جس کا ظاہر ہے کہ یہی مطلب ہے کہ ہم آج کل جس علم کو تصوف کہتے ہیں اس علم میں بھی امام کا وہی مقام تھا جو فقہ میں ان کا تھا اور یہ تو ایک معمولی سی مثال ہے، امام کی سوانح عمریوں سے چاہا جائے تو اس قسم کے اقوال اور شہادتوں کا ایک ذخیرہ فراہم کیا جا سکتا ہے، اور یہی کیفیت فقہ کے دوسرے ائمہ مجتہدین مالک و شافعی احمد و سفیان ثوری، اوزاعی وغیرہم رحمہم اللہ کی ہے۔

لیکن پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ ان بزرگوں سے باضابطہ اسی شکل میں جس شکل میں فقہ کے مسائل منقول ہیں دوسرے علوم و فنون کے مسائل نقل نہیں کئے گئے، اور اسی چیز نے لوگوں کو اس مغالطہ میں مبتلا کر دیا کہ لے دے کر سارا دین، ساری شریعت صرف وہی ہے جو فقہ کی کتابوں میں ہے، رفتہ رفتہ اس خیال میں غلو پیدا ہوا، اور کیسا غلو؟ اس حد تک تو خیر غنیمت تھا جیسا کہ ابن نجیم نے "الخلاصہ" سے یہ فتویٰ نقل کیا ہے۔

النظر في كتب اصحابنا من غير سماع افضل من قيام الليل [2]	ہمارے بزرگوں کی فقہی کتابوں کا مطالعہ استاذ سے سنے بغیر بھی رات کے قیام یعنی تہجد کی نماز سے افضل ہے

[1] ذیل الجواہر المضیہ مطبوعہ دائرۃ المعارف ص ۵۱۹ ۔ [2] بحر الرائق بحوالہ خلاصہ ج ۱ ص ۶ ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یعنی درسًا استادوں سے پڑھنا اور ان کے مطالب کا سمجھنا ہی نہیں بلکہ بغیر استاد کے یوں ہی فقہ کی کتابوں کا دیکھنا اس کو قرآنی حکم قم اللیل (کھڑے ہو رات کو) خواہ اس کا وجوب باقی نہ رہا ہو لیکن بہرحال قرآنی حکم ہونے میں تو اس کے شبہ نہیں ہے اس پر بھی برتری حاصل ہے۔ گویا جیسے قرآن نے۔

اِنَّ نَاشِئَۃَ اللَّیْلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِیْلًا ۝ — قطعا رات کا اٹھنا[1] (نبسے اور رضا میں توافق کی) شدید ترین صورت ہے اور بات کرنے کی بڑی مضبوط راہ

قرار دیا ہے، اسی قیام اللیل سے ہر قسم کی فقہ کی کتابوں کا نہیں بلکہ صرف حنفی فقہ کی کتابوں کا دیکھنا افضل قرار دیا گیا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ آخر میں تو فتوے نے وسعت یہاں تک حاصل کی۔

ان تعلم الفقہ افضل من تعلم باقی القرآن[2] — فقہ کا سیکھنا باقی قرآن کے سیکھنے سے بھی افضل ہے۔

جس کا شائد مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ قرآن کی ڈیڑھ سو یا زیادہ سے زیادہ پانچسو آیتوں جن سے فقہی مسائل کا تعلق ہے ان کا سیکھنا قرآن کی باقی ماندہ ہزارہا ہزار آیتوں کے سیکھنے، اور پڑھنے سے زیادہ افضل ہے۔

غلو[3] اور اغراق کے یہی وہ تفریطی حدود ہیں جنھیں دیکھ دیکھ کر دوسرے طبقات کے لوگ پھر مخالفت میں بھی اسی قسم کی شدت اختیار کر لیتے ہیں میں نے ان چند چیزوں کو قصدًا اسی لئے نقل کیا ہے تاکہ لوگوں کو معلوم ہو کہ فقہا جنھیں پچھلے زمانوں میں "ملاؤں" کے گروہ سے موسوم کر کے بعض طبقوں میں مذاق اڑایا جاتا تھا، اس میں مذاق اڑانے والوں کی جہالت کے ساتھ ساتھ نیک ناموں کو بدنام کرنیوالے

---

[1] بعضوں نے اشد وطأ کا ترجمہ کیا ہے کہ نفس کو روندنے کے حق میں سخت ترین صورت ہے [2] بحر الرائق ج ا ص ۶

[3] اسی غلو کی ایک مثال یہ ہے کہ فقہ میں قدوری کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی تلاوت طاعون و وبا کے ازالہ کے لئے مفید ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ استاذ سے جو قدوری سبقًا سبقًا پڑھے گا جتنے مسئلہ اس میں ہیں اسی قدر درہم اسے ملیں گے۔

(دیکھو مفتاح السعادۃ لطاش کبری زادہ)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نادان دوستوں کی عنایت فرمائیاں بھی شریک ہیں ورنہ جن کی نظر "اسلام" کے تمام عناصر اور اجزا پر ہے ان کے نزدیک نہ یہ صحیح ہے نہ وہ صحیح ہے، محض اس لئے کہ حضرت امام ابوحنیفہؒ امام شافعیؒ سے فقہ کے مسائل مثلاً منقول ہیں، اس لئے اسی کو "کل اسلام" قرار دینا، اس کی مثال تو ایسی ہے کہ اگر بجائے فقہی مسائل کے امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ سے صرف "فن تجوید و قرأۃ" کے مسائل منقول ہوتے تو کیا صرف "تجوید و قرأۃ" ہی کو "کل دین" قرار دیدیا جاسکتا تھا؟ اور کیا کہا جائے آج تو ان قاریوں میں بھی ایسے حضرات سے مجھے ملنے کا اتفاق ہوا ہے جن کا قریب قریب اپنے اس فن کے متعلق وہی خیال ہے جو الخلاصہ سے میں نے فقہ کے متعلق بعض فقہار کے الفاظ نقل کئے ہیں۔

بہر حال گو یہ تمہیدی گفتگو ذرا طویل ہوگئی لیکن بعض فاحش اغلاط کا ممکن ہے کہ اس بیان سے ازالہ ہو، اس لئے میں نے قصداً طوالت سے کام لیا۔ اب میں اصل مضمون کی طرف متوجہ ہوتا ہوں یعنی اس زمانہ میں جس علم کا نام فقہ ہے اس کی تدوین کی تاریخ بیان کرتا ہوں۔

دینِ اسلام کی ایک خاص خصوصیت

اس پر تو غالباً مجھے کسی تفصیلی بحث کی ضرورت نہیں کہ منجملہ دیگر امتیازات کے اسلام کی ایک بڑی خصوصیت یہ بھی ہے جیسا کہ میں نے اپنی کتاب "النبی الخاتم" میں لکھا ہے کہ اسلام بھی اگرچہ ایک مذہب اور دینی دعوت و تبلیغ کی ایک شکل تھی، لیکن "النبی الخاتم" کے الفاظ میں۔

"گلیلی، جھیل کے چند ماہی گیروں، یا مگدہ دیش کے گداگر بھکشوؤں کے ساتھ نہیں بلکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی و نبوت کے ذریعہ سے مہیا ہونے والا

"تجربات و مشاہدات کا ہی وہ ذخیرہ تھا جس کی حفاظت و نگرانی کا فرض کسی خانقاہ کے درویشوں یا کسی مدرسہ کے معلموں یا کسی انجمن کے ممبروں یا کسی کانفرنس کے دفتریوں، یا کسی افسانہ نگار مورخ کی انگلیوں کے سپرد نہیں کیا گیا، بلکہ سب جانتے ہیں کہ زمین پر، روئے زمین پر اس زمانہ کی جو سب سے بڑی قاہرہ سلطنت تھی اس نے اپنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پہلا فریضہ بھی اسی کی حفاظت و تبلیغ کو قرار دیا۔ اور اس کا آخری فریضہ بھی یہی تھا درمیان کے جتنے مقدمات تھے وہ صرف ایک مقصد کے حصول کے ذرائع تھے دنیا کی اسی سب سے بڑی سلطنت نے اپنی ہر قسم کی قوتوں کو صرف اسی کی نگرانی اور نشر و اشاعت کے لئے مخصوص و محدود کر دیا تھا۔ [1]

مشہور عیسائی مورخ جرجی زیدان کا یہ بیان اگر صحیح ہے کہ ایران و روم (جن دونوں حکومتوں کو پچھاڑ کر مدینہ میں حکومت قائم ہوئی) ان دونوں یعنی ایرانیوں اور رومیوں میں اختلاف و جنگ کی وجہ یہ تھی کہ

التنازع علی سیادۃ العالم لانھما	سارے عالم پر تسلط کی حاصل کرنے کے لئے یہ دونوں
کانتا اعظم دول الارض فی	کش مکش کر رہے تھے۔ کیونکہ روئے زمین پر سب سے
تلک العصور فارادت کل منھما	بڑی حکومتیں یہی دونوں تھیں، ہر ایک حکومت
الاستیثار بالسلطنۃ دون	ان میں یہی چاہتی تھی کہ دوسرے کے مقابلہ میں اسی
الاخری۔ [2]	کا اقتدار عالم پر قائم ہو جائے۔

جب یہ دونوں حکومتیں "اعظم دول الارض فی تلک العصور" [3] تھیں تو ظاہر ہے کہ جس قوت نے دونوں حکومتوں کو گرا کر اپنی سیادت و سلطنت کا پھریرا دنیا میں اڑا دیا تھا، وہی اس زمانہ کی دنیا میں سب سے بڑی سلطنت قرار پا سکتی ہے، اور اس کے اظہار کی تو ضرورت نہیں کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ڈھائی سالہ خلافت ہو یا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی گیارہ، ساڑھے گیارہ سال کی حکومت، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے کل تیرہ سال کے اندر اندر دنیا کی اس سب سے بڑی حکومت نے جو کام کیا، وہ اصل مقصد کے لحاظ سے اسلام کی حفاظت و تبلیغ ہی کا کام تھا، اور جیسا کہ میں نے النبی الخاتم میں ہی لکھا ہے۔

---

[1] النبی الخاتم ص ۱۸۴۔ [2] [illegible]ن الاسلامی ج ا ص ۱۲۶۔
[3] یعنی روئے زمین کی حکومتوں [illegible] بڑی حکومت و سلطنت رومیوں اور ایرانیوں ہی کی تھی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"طاقت کی ان آہنی زنجیروں کی بندش میں حکومت ہی کی سرپرستی میں اس کی (یعنی اسلام کی) تاریخ کا آغاز ہوا، اور دیکھو کہ مسلسل اسی طرح ایک حکومت دوسری حکومت کو یہ ودیعت سونپتی چلی آئی۔" (ص ۱۸۴)

بہرحال اسلام کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ جوں ہی اس کا قدم مکہ سے باہر نکل کر مدینہ پہنچا، معًا اس کی پشت پناہی کے لئے عجیب و غریب سیاسی قوت اس کے پیچھے مہیا ہوگئی عہد فاروقی و صدیقی کے سوا خود عہدِ نبوت میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم منیٰ کے میدان میں جس وقت اپنا مشہور وداعی خطبہ اونٹنی کی پیٹھ پر سے سنا رہے تھے تو اس وقت جہاں آپ سارے جہاں کے قیام قیامت تک کے لئے آخری پیغمبر تھے، اسی کے ساتھ اس ملک کی آزاد حکومت کے آپ تنہا فرمانروا بھی تھے، جرجی زیدان کے الفاظ میں جس کے حدود اربعہ یہ ہیں۔

شاھد النبی صلی اللہ علیہ وسلم مملکتہ تمتد من تبوک وایلہ شمالا والی شواطی الیمن جنوبا ومن خلیج العجم شرقا الی بحر القلزم غربا۔[1]	پیغمبر نے مشاہدہ کیا کہ شمالاً تبوک سے ایلہ تک اور جنوباً یمن کے ساحل تک شرقاً خلیج فارس تک بحر قلزم تک غرباً ان کی حکومت پھیلی ہوئی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دوست و دشمن سب ہی کا اس پر اتفاق ہے کہ

لما توفی النبی سنۃ ۱۱ کانت سطوۃ الاسلام قد ظللت کل جزیرۃ العرب[2]	سنہ ۱۱ھ میں جب پیغمبر کی وفات ہوئی تو اسلام کی حکومت سارے جزیرۂ عرب پر چھائی ہوئی تھی۔

اب دس لاکھ مربع میل زمین کی اس آبادی[3] کا خیال کیجئے جو عہدِ نبوت ہی میں زیر نگین

[1] التمدن الاسلامی جرجی زیدان ج ۱ ص ۹۳۔ [2] ایضاً

[3] یہ صحیح ہے کہ عرب کا ایک بڑا حصہ غیر آباد اور بیابان تھا اور اب بھی ہے لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ عرب میں آدمی آباد ہی نہ تھے۔ یمن، نجد اور شام و عراق کے ملحقات جو عرب کے سرسبز علاقے ہیں، عرب کے واحات (نخلستانوں) کی آبادیاں اور بیابان نورد قبائل کی بھی کافی تعداد تھی۔ خصوصاً اسلام سے پہلے عربوں کو اپنے ملک کے سوا دوسرے ممالک میں آباد ہونے کا چونکہ موقع نہیں ملتا تھا۔ (باقی حاشیہ ص ۴۷ پر ملاحظہ ہو)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام آچکی تھی۔ اور عہد رسالت کے بعد دس بارہ سال کی قلیل مدت میں خلافت صدیقی و فاروقی میں ایران و مصر و شام والجزیرہ و ترکستان تک اسلام کی جو حکومت پھیل گئی، پھر عثمانی عہد میں مزید اضافے فتوحات کے جو ہوئے، انسانوں کی کتنی بڑی تعداد اسلام کے احاطہ میں داخل ہوگئی تھی اس کے اندازے کے لئے بھی بجائے اسلامی مورخین کے یہ مناسب ہوگا کہ کسی غیر ہی کی شہادت پیش کردوں جرجی زیدان ہی کا بیان ہے اور واقعات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے وہ لکھتا ہے۔

الکثر سکانھا معظم امم العالم المتمدن	(اسلامی حکومت کے مقبوضہ میں) اس زمانہ
فی ذلک الحین وفیہم العرب و	کی متمدن دنیا کا بڑا حصہ داخل ہوگیا تھا جس میں
الفرس والکلدان والروم والقوط	عرب بھی تھے اور ایران کے باشندے بھی ان
والقبط والنوبہ والبربر وکانوا	میں کلدانی بھی تھے اور روم والے بھی اور گاتھ
یتکلمون العربیۃ والفارسیۃ والبھلویۃ	قوم کے لوگ بھی قبطی بھی، سوڈانی بھی بربر بھی
والھندیۃ والرومیۃ والسریانیۃ	جو زبانیں یہ بولتے تھے ان میں عربی، فارسی
والترکیۃ والکردیۃ والارمینیۃ و	ہندی، رومی، ترکی، کردی اور ارمنی، نیز قبطی
القبطیہ والبربریۃ وغیرھا۔	اور بربری کے سوا بھی زبانیں تھیں۔

جرجی زیدان نے قدیم معتبر وثائق سے یہ ثابت کیا ہے کہ اس زمانہ میں تین کروڑ کی آبادی تو صرف ایک ملک مصر کی تھی، مجموعی طور پر پہلی صدی ہجری میں ممالک محروسہ اسلامیہ کے متعلق جرجی زیدان کا تخمینہ آبادی کے متعلق یہ ہے کہ

ان یکون احصاء المملکۃ الاسلامیۃ فی ابان	اسلامی قلمرو کی آبادی اپنے عنفوان شباب
عمرانھا ...... ۲۵ نفوس الی ۳۰ ملیون	میں پچیس کروڑ سے تیس ملین تک تھی

(بقیہ حاشیہ ص ۴۲) اس لئے جس حال میں ہو وہ اسی ملک میں پھیلتے جاتے تھے، اسلام کے بعد البتہ وہ ساری دنیا میں پھیل گئے اس لئے ابتدار اسلام میں ماننا چاہئے کہ موجودہ زمانہ سے بھی زیادہ عرب آباد تھا۔ اس کا ثبوت تاریخی وثائق سے ملتا ہے جس کے ذکر کا یہاں موقع نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی عیسائی مصنف نے اپنے اس بیان کو اس فقرہ پر ختم کیا ہے۔

نحو تعداد سکان | مردم شماری کی یہ تعداد وہی ہے جو اس وقت
اوربا کلہا الاٰن | پورے یورپ کی ہے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ مندرجہ بالا تعداد میں ان فتوحات کے باشندوں کو بھی شریک کر لیا گیا ہے جن کا اضافہ خلافتِ راشدہ کے کچھ دن بعد ہوا۔

لیکن تاریخ اسلامی کے علما جانتے ہیں کہ ۲۵ سے تیس کرور تک کے اس تخمینہ میں کم از کم یہ ماننا پڑے گا کہ پندرہ سے بیس کرور تک کی آبادی عہدِ خلافتِ راشدہ ہی کی ہونی چاہئے، کیونکہ اصل آباد ممالک ظاہر ہے کہ زیادہ تر حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہما ہی کے زمانہ میں فتح ہو چکے تھے۔

بہر حال پہلی صدی ہجری کے اختتام تک اسلامی حکومت کے دائرہ میں بتدریج پچیس سے تیس کرور تک یعنی موجودہ یورپ جس میں بیسیوں ممالک اور اقالیم کے لوگ آباد ہیں[۵] اس کی جو آبادی ہے اسی کی مساوی آبادی پر اسلام کا ایک قانونی حکومت کی شکل میں چھا جانا اور اسی کے ساتھ اگر اس واقعہ کو بھی ملا لیا جائے کہ رعایا ہونے کے ساتھ ساتھ ان ممالک مفتوحہ کے عام باشندے بسرعت تمام افواجاً کی شکل میں حلقہ بگوش اسلام بھی ہوتے چلے جا رہے تھے تو یہ واقعہ کیا خود بخود اس ضرورت کو ناگزیر نہیں بنا رہا ہے کہ آدمیوں کی اتنی عظیم آبادی کے ساتھ آئے دن جو نت نئے حوادث و واقعات پیش آ رہے تھے ان کی راہنمائی کے لئے اسی عملی دستور سے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن و سنت کے نام سے عطا فرمایا تھا جواب نہ پیدا کیا جائے؟

میں دیکھتا ہوں کہ ہماری جامعہ (عثمانیہ یونیورسٹی) جس کے حلقہ اثر میں بہ مشکل دو ڈھائی ہزار

سلہ[۵] یہ بات جرجی زیدان کے قول کے مطابق لکھی گئی ہے یعنی اس زمانہ کی بات ہے جس وقت جرجی زیدان نے اپنی کتاب مرتب کی تھی جس پر بیس یا پچیس سال کا زمانہ گذرا ہوگا بعد کی مردم شماریوں نے یورپ کی آبادی میں جو اضافہ کر دیا ہے وہ میرے پیشِ نظر نہیں ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آدمی ہوں گے، حالانکہ ہر ہر شعبہ کے متعلق مستقل قوانین بنا بنا کر اربابِ حکومت کی طرف سے طبع کرا دیئے گئے ہیں لیکن شاید ہی کوئی دن گذرتا ہو گا جب ان ہی مطبوعہ اساسی قوانین کی روشنی میں نئے پیش آنے والے واقعات کے متعلق ہمارے نائب معین امیر (پرووائس چانسلر) کو کوئی نیا حکم، نئی گشتی نہ جاری کرنی پڑتی ہو۔

اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جب دو ڈھائی ہزار کے حلقہ کا یہ حال ہے تو جس دستور کے تحت اچانک بیس پچیس کروڑ نفوس داخل ہوگئے ہوں ان کے متعلق قدرتاً کتنی شدید ضرورت اس کی پیدا ہوئی ہوگی کہ ہر نئے حادثہ اور واقعہ کے متعلق بتایا جائے کہ جو دستور ان پر نافذ کیا گیا تھا، اس کے اعتبار سے اس حادثہ اور واقعہ پر کیا حکم لگایا جائے۔ جس کتاب نے اپنے متعلق

تبیاناً لکل شئ ہر چیز کی بیان کرنے والی

اور اسی قسم کے بیسیوں الفاظ میں احاطۂ عام اور احتوا رتام کا دعویٰ کیا ہے کیا یہ سمجھ میں آنے کی بات ہے کہ وہی کتاب اس باب میں ناکافی ہوتی، یہ صحیح ہے کہ قرآن کے متعلق

جمیع العلم فی القرآن لاکن تقاصر عنہ افہام الرجال

(دنیا جہان کے تمام علوم قرآن میں ہیں لیکن لوگوں کی سمجھ ان کو پانے سے معذور ہے)

کا دعویٰ قرآن کے ساتھ نادانوں کی دوستی ہے اور جن نیک لوگوں نے جیسا کہ ملا جیون نے لکھا ہے

حتی استنبط بعضہم علم الہیئۃ والھندسۃ والنجوم والطب[۵] یہانتک کہ بعضوں نے قرآن سے علم ہیئت اور ہندسہ نجوم وطب کے مسائل بھی مستنبط کئے ہیں۔

اور اسی تفسیر کے محشی صاحب نے اس پر یہ اور اضافہ فرمایا ہے۔

اقول والجبر والمقابلۃ والجدل والنجامۃ میں کہتا ہوں کہ اور جبر و مقابلہ علم الجدل و علم النجامۃ (ستارہ شناسی) بھی قرآن سے نکالا گیا ہے۔

حالانکہ قرآن جو "ان الدین عند اللہ الاسلام" کی شرح ہے یعنی وہ ایک دینی کتاب ہے

---

[۵] تفسیرات احمدیہ ص ۴ ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور گذر چکا کہ "الدین" یا "مذہب" کا اصل موضوع انسان ہے، سورہ فاتحہ میں انسانیت ہی کے لئے الصراط المستقیم کی درخواست بارگاہ ربانی میں پیش کی جاتی ہے، مطلب یہی ہوتا ہے کہ انسانیت اپنے ارتقاء وعروج کی منزل تک جس سیدھی راہ سے پہنچ سکتی ہو، اس کی ہدایت کی جائے۔ السبع المثانی[1] کے اسی درخواست کا جواب "القرآن العظیم" ہے۔

---

[1] سورۂ فاتحہ یعنی الحمد کا نام قرآن میں سبع مثانی ہے۔ سبع کے معنی سات کے ہیں اور مثانی ایسی چیز کو کہتے ہیں جو دو دو دفعہ دہرائی جائے۔ سورہ فاتحہ چونکہ سات آیتوں پر مشتمل ہے یہ وجہ تو السبع یعنی سات کہلانے کی ہوئی۔ باقی مثانی کیوں کہتے ہیں تو بظاہر اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ نماز میں یہ سورہ جب پڑھی جاتی ہے تو کم ازکم دو رکعتوں میں دو دفعہ اس کا دہرانا ضروری ہے یعنی دربار الٰہی میں اس عرضداشت کی خواندگی دو دفعہ ہونی چاہیئے۔ اسی لئے صرف ایک رکعت والی نماز کا نام "البتیراء" (دم کٹی نماز) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے رکھا ہے اور حدیث صلوٰۃ اللیل والنہار مثنیٰ مثنیٰ (یعنی رات اور دن کی نماز کو دو دو ہونا چاہیئے) اس کا بھی میرے خیال میں یہی مطلب ہے کہ دو سے کم نہ ہونا چاہیئے۔

خود قرآن سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ گو سورہ فاتحہ بھی اسی ذات پاک کا عطیہ ہے جس نے مسلمانوں کو قرآن عطا کیا ہے اور لفظاً و معناً دونوں وحی ربانی ہیں، لیکن سورہ فاتحہ القرآن العظیم سے کوئی الگ مقابلہ کی نسبت رکھتی ہے آخر اگر دونوں ایک ہی چیز ہوتی تو آتیناک سبعا من المثانی والقرآن العظیم (ہم نے تم کو المثانی کی سات آیتیں اور قرآن عظیم عطا کیا ہے) نہ فرمایا جاتا۔ یعنی دونوں کو الگ کرکے نہ بیان کیا جاتا اور بات بھی یہی ہے سورہ فاتحہ کا مضمون بالکل ایک ایسی درخواست کا مضمون ہے جو شاہی دربار میں پیش کی گئی ہو، مالک یوم الدین تک تو بادشاہ کے القاب وصفات کا بیان ہے ایاک نعبد وایاک نستعین (تجھی کو ہم پوجتے اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) یہ فدوی درخواست گذار کی حیثیت کا بیان ہے آگے اھدنا الصراط المستقیم سے آخر تک درخواست کا مضمون ہے، جسے امام نمازیوں کی طرف سے شاہی دربار میں پیش کرتا ہے۔ آمین گویا اس درخواست کے ساتھ اظہار اتفاق کے دستخط کی حیثیت رکھتا ہے جب درخواست پیش ہو جاتی ہے تو جواب میں امام خدا کی نمایندگی کرتے ہوئے قرآن کا کوئی حصہ سناتا ہے جو ظاہر ہے کہ کسی نہ کسی حیثیت سے صراط مستقیم ہی سے تعلق رکھتا ہے الغرض سرکاری دفاتر میں جیسے درخواستوں کا تختہ چھاپ کر خود سرکار کی طرف سے رکھ دیا جاتا ہے۔ یہی حال سورہ فاتحہ کا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے خود ہی درخواست کا مضمون مرتب کرکے بندوں کے حوالہ فرما دیا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پس "القرآن العظیم" کا موضوع انسانیت کا یہی صراطِ مستقیم ہے، دوسرے لفظوں میں اسی کو یوں بھی ادا کیا جا سکتا ہے، جیسا کہ میں نے پہلے بھی کہا ہے کہ ساری کائنات سے تو انسان بحث کرتا ہے لیکن خود انسان سے مذہب بحث کرتا ہے، اس لئے قرآن جو ظاہر ہے کہ مذہب اور دین ہی کی کتاب ہے، اس میں ہر چیز کے ہونے کے معنی یہی ہو سکتے ہیں کہ انسان اور تمام وہ قوتیں جو واقعی انسانی قوتیں ہیں، ان کے بناؤ بگاڑ، صلاح و فساد کے متعلق جو کچھ کہا جا سکتا ہے، سب کہہ دیا گیا ہے، قرآن کے دعوی۔

ما فرطنا فی الکتاب من شئ — ہم نے کتاب (قرآن) میں کسی چیز کو چھوڑ نہیں دیا ہے

کا اگر یہ مطلب ہو اور

الیوم اکملت لکم دینکم — آج کامل کر دیا میں نے تمہارے لئے تمہارے دین کو

اتممت علیکم نعمتی — اور پوری کر دی میں نے تم پر اپنی نعمت۔

میں اکمال اور اتمامِ نعمت کو اس پر محمول کیا جائے تو بلا شبہ قرآن اس دعوی کا مستحق ہے لیکن جو چیزیں نہیں ہیں یا انسان کی انسانیت کو ان سے تعلق نہیں ہے ظاہر ہے کہ اس کے موضوعِ بحث سے چونکہ وہ خارج ہیں اس لئے ان کو قرآن میں تلاش کرنا بجنسہ ایسی بات ہوگی جیسے اقلیدس کی کتاب میں طب کے نسخے ڈھونڈنا، یا نحو کے رسالوں میں کیمسٹری کے مسائل کوئی تلاش کرے۔ مجنوں کے سوا بھلا اس قسم کی بے جوڑ، ان میل حرکتوں کی توقع اور کس سے ہو سکتی ہے، قرآن کے کل شئ (سب کچھ) کی الفاظ سے منطق والا "کل" مراد لینا عربی زبان کے محاوروں سے جہالت کا نتیجہ ہے، آخر قرآن ہی میں عاد کی آندھی کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ

تُدَمِّرُ کُلَّ شَیْءٍ — ڈھا دیتی تھی ہر چیز

تو "کل شئ" (ہر چیز) میں کیا آفتاب، ماہتاب، ستارے زمین، سارے جہان کے پہاڑ بلکہ ملائکہ جن شیاطین کو بھی داخل کرنا کیا صحیح ہوگا؟ قرآن میں تو شئ کا اطلاق ذاتِ حق پر بھی کیا گیا ہے۔ العیاذ باللہ منطقی "کل" کو قرآنی "کل" پر اگر منطبق کیا جائے گا تو عربیت کی خلاف ورزی کے سوا خود منطقی ژولیدگیاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کیا کم پیدا ہوں گی، ایسے مواقع پر "سب کچھ" کے احاطہ کی تعئین قرائن سے کی جاتی ہے مثلاً عاد والی آیت میں یہی مطلب ہوگا کہ جو چیزیں برباد ہو سکتی تھیں ان کو اس آندھی نے ڈھا کر رکھدیا۔

پس صاف اور سیدھی بات زبان اور محاورے کے مطابق یہی ہے کہ قرآن کی "کلیت" کا احاطہ ان ہی مسائل تک محدود رکھا جائے جن کا الدین سے تعلق ہے اور یہی حال "السنۃ" یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جوامع الکلم اقوال اور آپ کی ہر جہتی زندگی کا ہے جو انسانیت کی ہر شکل میں ہر حال کے لحاظ سے اپنے اندر کامل نمونہ رکھتی ہے۔

بہر حال حسی معلومات سے متاثر ہونے کے بعد جس طرح عقلِ انسانی میں ہلچل پیدا ہوتی ہے اور اسی ذہنی تلاطم، عقلی ہلچل کا نتیجہ ہے کہ ہماری لائبریریاں ان علوم و فنون کی کتابوں سے بھری چلی جارہی ہیں جنھیں اصطلاحاً ہم عقلی علوم و فنون کہتے ہیں۔ حالانکہ محسوسات کی حد تک ہماری معلومات اور حیوانوں کی معلومات میں جیسا کہ عرض کیا گیا چنداں فرق نہیں ہے لیکن حواس کے ان ہی محدود معلومات سے عقل انسانی نے جس طرح اس راہ میں علم کا سمندر پیدا کر دیا ہے۔ غور کرنے کی بات ہے کہ بجائے حسی معلومات کے اسی انسانی عقل پر علام الغیوب، عالم الغیب والشہادت کے عطا کئے ہوئے معلومات کا جب عکس پڑا خواہ ان معلومات کا ظہور الکتاب (القرآن) کے ذریعہ سے ہوا ہو، یا اسی الکتاب کی عملی تشکیل و تشریح "السنۃ" کی راہ سے یہ معلومات حاصل ہوئے ہوں۔

بہر حال یہ کہنا کیا صحیح ہو سکتا ہے کہ ان معلومات کے حصول کے بعد وہی عقل جو ایک ایک معلوم سے لاکھوں نتائج پیدا کر رہی تھی، وحی و نبوت کے ان معلومات کے پانے کے بعد بالکل کند اور جامد خامد بن کر رہ گئی جو کتاب لعلکم تتفکرون (تاکہ تم سوچو) لعلکم تعقلون (تاکہ تم سمجھو) وغیرہ عقلی بیداری کے پیغاموں سے لبریز ہے کیا اسی کتاب کے متعلق یہ دعوٰی صحیح ہو سکتا ہے کہ نازل ہونے کے ساتھ ہی اس نے دماغوں کو مفلوج، عقلوں کو کند، ذہنوں کو غبی بنا دیا۔

وحی و نبوت کے معلومات کا اظہار محدود الفاظ میں کیا گیا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ وحی و نبوت کی راہ سے جو معلومات بھی ہمیں عطا کئے گئے ہیں ظاہر ہے کہ محدود الفاظ ہی کے قالب میں عطا ہوئے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں، اور جیسا کہ میں عرض کرتا چلا آرہا ہوں کہ دوسری طرف انسانی زندگی کے ہر شعبہ کا یہ حال ہے کہ ہر دن جو آفتاب طلوع ہوتا ہے کچھ ایسے نئے پیچیدہ حالات کے ساتھ طلوع ہوتا ہے جن کی نظیر اس سے پہلے موجود نہیں ہوتی۔ یعنی جن پیش آنے والے نت نئے واقعات کو فقہا کی اصطلاح میں۔

"الحوادث والنوازل"

کہتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایک طرف وحی و نبوت کے معلومات کے الفاظ کی محدودیت، دوسری طرف "الحوادث والنوازل" کی غیر محدودیت یہ دونوں واقعات ایسے ہیں کہ عقل کی دخل اندازی کے بغیر اس "خلا" کا پُر کرنا محال ہے، یہ احتمال کہ ہر پیش آنے والے حادثہ اور نازلہ کے متعلق اللہ میاں نے آیت ہی کیوں نہ نازل فرمادی اور خواہ مخواہ عقلی اجتہاد اور کوشش کی تکلیف میں لوگوں کو مبتلا کر دیا گیا۔ اولاً تو یہ یوں بھی کچھ مہمل اور احمقانہ سی بات ہے آخر یہی اعتراض ان لوگوں کو حسی معلومات کے سلسلہ میں کیوں نہیں ہوتا کہ جو کچھ آدمی کو عقل کے غور و فکر سے معلوم ہوتا رہتا ہے، اللہ میاں نے ان کو یوں ہی محسوس شکل کیوں نہ عطا کر دی، انسان کے سارے ایجادات و اختراعات کو خود ہی کیوں نہ پیدا کر دیا، ماسوا اس کے سوچنے کی بات یہ ہے کہ قیامت تک پیش آنے والے جزئیات جو سارے جہان کے ہر مرد عورت کے ساتھ پیش آسکتے تھے۔ مختصر سے مختصر الفاظ میں بھی اگر ان کی تعبیر کی جاتی تو غالباً دنیا میں کاغذی مواد کا جو ذخیرہ اس وقت پایا جاتا ہے سب خرچ ہو جاتا اور شاید کام پورا نہ ہوتا۔ خیال تو کیجئے کہ معلومات کے اس پشتارے کی نقل کون کرتا ان کی حفاظت کیسے ہوتی، اس وقت جبکہ کم و بیش قرآن کل (۷۷۹۳۴) الفاظ کا مجموعہ ہے۔ اس کی حفاظت اور نگرانی میں اگر واقعی خدا کا غیبی ہاتھ کام نہ کرتا تو جس طرح دوسرے مذاہب کے آسمانی وثیقے مختلف تاریخی اشتباہات کی تیروں سے آج چھلنی بنے ہوئے ہیں۔ قرآن کا بھی خدانخواستہ یہی حال ہو جاتا۔ پھر سوچا جا سکتا ہی کہ لامحدود جزئیات کے لامحدود تعبیرات کی حفاظت کی شکل کیا ہو سکتی تھی۔

ماسوا اس کے واقعہ یہ ہے کہ قرآن کے معدودے چند کلیات پر تو عمل کرنا ہمارے لئے دشوار ہو رہا ہے، کتنے ہیں جو ہم میں قرآن کے صریح نصوص کے خلاف باوجود مسلمان ہونے کے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زندگی گذار رہے ہیں۔ اگر ہر ہر جزئی مسئلہ کی حیثیت بھی نصِ صریح کی ہو جاتی تو اس وقت ہماری موجودہ غلط زندگی کی غلطیاں کتنی مہیب اور خطرناک ہو جاتیں۔ آج تو ہم فقہی جزئیات کے متعلق یہ سوچ کر کہ فقہاءِ اسلام کا یہ اجتہادی نتیجہ ہے براہِ راست قرآن کا کوئی نصِ محکم تو نہیں ہے اپنی غلطی کی شدت میں خفت پیدا کر لیتے ہیں۔ لیکن آج جو کچھ شامی عالمگیری بحرالرائق میں ہے اگر سب قرآن میں ہوتا تو پھر ہماری بدبختیوں کا کیا حال ہوتا۔

ان مسائل کا اجتہادی ہونا، اجتہاد میں مختلف فقہاء امت کا قدرتی طور پر مختلف ہو جانا یہ واقعہ ہے کہ ہم سست کاہل الوجودوں، ضعیف ارادہ والوں کے لئے جائے پناہ بنا ہوا ہے اور غالباً اس مشہور حدیث کا جس میں آیا ہے کہ امتِ اسلامیہ کا اختلاف ان کے لئے رحمت بن جائے گا۔ ایک پہلو اس کا یہ بھی ہے، جس کی تفصیل آئندہ بھی آ رہی ہے۔

بہرحال وحی و نبوت کے ذریعہ سے جو معلومات امت تک پہنچے ہیں ان کے الفاظ کی محدودیت اور حوادث و نوازل کی محدودیت، یہی وہ ضرورت ہے جس کی تکمیل کے لئے دنیا ہی میں نہیں دین میں بھی ہم عقل اور فقہ کے محتاج ہیں۔

مشہور اسلامی فیلسوف یعنی معلم المغرب علامہ ابن رشد مالکی اپنی فقہی یادداشت بدایۃ المجتہد میں اسی خیال کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

ان الوقائع بین اشخاص الاناسی غیر متناھیۃ والنصوص والافعال والاقرارات متناھیۃ ومحال ان یقابل ما لا یتناھی بما یتناھی	انسانی افراد کے درمیان جو حوادث و واقعات پیش آتے ہیں وہ غیر محدود ہیں اور نصوص وافعال و اقرارات (یعنی جن سے مسائل پیدا کئے جاتے ہیں) محدود و متناہی ہیں، محال ہے کہ غیر محدود کا مقابلہ محدود سے کیا جائے۔

اسی خیال کی تائید مشہور حنبلی المذہب عالم حافظ ابنِ قیم تک نے ان الفاظ میں کی ہے۔

من لہ مباشرۃ لفتاوی الناس	عام لوگوں کو فتویٰ دینے کے کام کا جنھیں تجربہ ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یعلم ان المنقول وان اتسع	وہ جانتے ہیں کہ منقولات، ملفوظات، خواہ جتنی بھی
غایتہ الاتساع فانہ لا یفی	وسعت حاصل کریں لیکن پھر بھی سارے جہان کے
بوقائع العالم جمیعاً [1]	سارے واقعات کا احاطہ نہیں کر سکتے۔

اور سر جان ڈائمنڈ نے اپنی کتاب اصولِ قانون میں جو یہ لکھا ہے۔

"بہر حال کسی ملک کے ججوں کے اختیار تمیزی کے بغیر صرف قانون سے انفصال مقدمات ناممکن ہے۔" (ص ۲۲)

سچ پوچھئے تو اس میں بھی اسی فطری ضرورت کا اظہار کیا گیا ہے۔

پھر جیسا کہ حسی معلومات کے متعلق میں نے عرض کیا تھا کہ حیوان اور انسان میں یہی فرق ہے کہ انسان اپنے حسی معلومات سے نتائج ونظریات کلیات وقوانین پیدا کرتا ہے اور گو اپنی اپنی حد تک مشکل ہی سے کوئی ایسا آدمی مل سکتا ہے جس کی عقل اس سلسلہ میں کچھ نہ کچھ کام نہ کرتی ہو، عالم وجاہل، خاصی وعامی سب ہی میں یہ خصوصیت پائی جاتی ہے، الا یہ کہ کسی کی دماغی حالت اتنی زبوں اور پست ہو کہ بجز شکل وصورت کے وہ اندر سے محض جانور ہو، یہی حال وحی ونبوت کے معلومات کے استعمال کا بھی ہے کہ کسی نہ کسی حد تک عقل کو دخل دینے کی ضرورت تو ہر شخص ہی کو پیش آتی ہے، اسی لئے سمجھا جاتا ہے کہ اجتہاد یعنی وحی ونبوت کے استعمال میں عقل کا استعمال اس کی ایک قسم ایسی بھی ہے جس پر ہر وہ شخص مجبور ہے جو شریعت کے قوانین کا مکلف ہے، اندلس ہی کے ایک عالم الشاطبی الغرناطی علامہ ابراہیم اپنی کتاب "الموافقات" میں فرماتے ہیں کہ یہ اجتہاد کی ایسی قسم ہے

لا یمکن ان ینقطع حتی	اجتہاد کا یہ وہ سلسلہ ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا جب تک کہ
ینقطع التکلیف وذلک	تکلیف شرعی کا سلسلہ ختم نہ ہو جائے اور یہ بات تو اسی وقت
عند قیام الساعۃ [2]	ہو سکتی ہے جب قیامت قائم ہو جائے۔

چند سطروں کے بعد اجتہاد کی اسی قسم کے متعلق فرماتے ہیں۔

---

[1] اعلام ج ۲ ص ۲۷۵ - [2] الموافقات ج ۴ ص ۲۴ مطبوعہ ٹیونس۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انہ لابد منہ بالنسبۃ الی کل	ہر غور و فکر کرنے والے کے لئے ہر حاکم ہر مفتی بلکہ
ناظر وحاکم ومفت بل بالنسبۃ	ہر اس شخص کے لئے یہ ناگزیر ہے جو بذاتِ خود
الی کل مکلف فی نفسہ	شریعت کا مکلف ہے۔

مثال سے اجتہاد کی اس عام ضرورت کو یوں سمجھاتے ہیں۔

فان العامی اذا سمع فی الفقہ	مثلاً ایک عامی مسلمان سنتا ہے کہ نماز میں کوئی ایسا
ان الزیادۃ الفعلیۃ فی الصلاۃ	کام جو نماز سے تعلق نہ رکھتا ہو، اس کی تھوڑی مقدار
سھو من غیر جنس الصلوٰۃ او	تو معاف ہے اور زیادہ ہو تو معاف نہیں ہے، اب
من جنسھا ان کانت یسیرۃ	اس کے ساتھ یہ صورت پیش آتی ہے کہ نماز میں
مغتضرۃ وان کانت کثیرۃ فلا	کوئی زائد از نماز کام اس سے صادر ہوتا ہے ظاہر ہے
فوقعت لہ فی صلوٰتہ زیادۃ فلا	کہ اس عامی کو بھی اس پر غور کرنا پڑے گا کہ اس کا فعل
بد لہ من النظر فیھا حتی یردھا	قلیل ہے یا کثیر دونوں قسموں میں سے کس قسم میں داخل
الی احد القسمین ولا یکون ذلک	ہے اور یہ بات اجتہاد و فکر و تامل ہی سے حاصل
الا باجتھاد ونظر	ہو سکتی ہے۔

علامہ الشاطبی کا اس کے بعد یہاں تک دعویٰ ہے اور بجا دعویٰ ہے کہ اگر دین میں عقل سے کام نہ لیا جائے گا تو

لم تنزل الاحکام الشرعیۃ علی	تمام شرعی قوانین کا وجود صرف ذہن میں گھوم کر
افعال المکلفین الا فی الذھن	رہ جائے گا۔

انھوں نے پھر ایک منطقی قاعدہ سے اس کو سمجھایا ہے کہ شریعت نے توہم سے جس چیز کا بھی مطالبہ کیا ہے، مثلاً نکاح کا ایک قانون نافذ کیا گیا ہے اب یہ بات کہ زید کا جو نکاح ہوا، اس پر شریعت کا نافذ کردہ دستورِ نکاح پورے طور پر منطبق ہے یا نہیں، اس کا پتہ عقل کے سوا اور کس ذریعہ سے چل سکتا ہے، فرماتے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

الا فعال لا تقع فی الوجود مطلقة	جتنے بھی افعال ہیں دائرہ وجود میں ان کا وقوع
وانما تقع معینة مشخصة فلا یکون	اطلاقی شکل میں ممکن نہیں بلکہ معین و مشخص ہی ہوکر
الحکم واقعا علیھا الا بالمعرفة بان	وہ وقوع پذیر ہوسکتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ اس
ھذا المعین یشملہ ذلک العام و	مطلق قانون کا انطباق اس معین شکل پر یوں
قد یکون ذلک سھلا وقد لا یکون	ہی ہوسکتا ہے کہ اس معین میں مطلق کا یا اس خاص
وکلہ اجتھاد۔	میں عام کا تحقق ہوا ہے یا نہیں یہ بات کبھی آسان
(ج ۴ ص ۴۴ - التونسیہ)	بھی ہوتی ہے اور کبھی دشوار بھی اور یہ سب اجتہادی ہے۔

میرے خیال میں عقل کو مذہب میں استعمال کرنے کی یہ وہ صورت ہے کہ آدمی جب تک جانور یا مجنوں نہ ہو، اس سے مستثنیٰ نہیں ہوسکتا اگر حسی معلومات میں جس طرح سب ہی عقل کو استعمال کرتے ہیں تاہم جیسا کہ پہلے بھی عرض کرچکا ہوں کہ ان میں ہر شخص حکیم یا سائنٹسٹ موجد ہونے کے مقام تک نہیں پہنچتا، بجنسہٖ یہی حال ان معلومات کا بھی ہے جو ہمیں وحی و نبوت کی راہ سے ملے ہیں کہ گو ایک حد تک ان معلومات کے متعلق اپنی عقلی قوت کے استعمال کرنے پر ہر ایک مکلف اور ہر مسلمان مجبور ہے، لیکن ان معلومات سے ان نتائج وکلیات کا استخراج جو آدمی کو امامت اور مجتہد مطلق کے مقام پر پہنچا دے، ظاہر ہے کہ ہر عامی مسلمان کے لئے آسان نہیں ہوسکتا، یہی وجہ ہے کہ جس طرح حسی معلومات سے حکیمانہ نتائج پیدا کرکے کوئی خاص نظام بنانے والے لوگ صدیوں اور ہزاریوں میں پیدا ہوتے ہیں اور بعد کو لوگ ان ہی "نوابغ" یا غیر معمولی شخصیتوں کی راہ پر چلتے رہتے ہیں، ان ہی کے کلام کی تشریح وتوضیح کرتے رہتے ہیں، یہی حال وحی ونبوت کے معلومات کا بھی ہے اور آج آپ کے سامنے دراصل اسلام کے ان ہی مایۂ ناز بزرگوں اور ان کے محیر العقول کارناموں کی داستان پیش کرنا میرا مقصود ہے۔

(باقی آئندہ)

© rasailojaraid.com